



کرنے کے قابل نہیں ہوں۔
 لکھنے کے لیے ہاتھ میں قلم اور کاغذ ہونا چاہیے
 میں دونوں چیزیں تھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میں
 اپنا ہاتھ بستر سے اٹھا نہیں سکتی۔ ہاتھ ہلانے کی کوشش
 کروں گی تو میرے جسم پر موجود زخموں سے خون رستا
 شروع ہو جائے گا۔ قلم ہاتھ میں تھاموں گی تو ہتھیلی کا
 ماس قلم کے ساتھ چپک جائے گا۔ انگلیاں موٹوں کی
 تو تیرے Knuckles (انگلیوں کے جوڑے) پر پڑنے والی
 جگہیں ہوتی ہیں۔ باقی ماندہ گوشت کو برتنہ کوڑھ
 کی جگہیں سلسل کھلی رکھنا بھی میرے لیے ممکن
 نہیں ہے۔ درد کم کرنے کی دوائیں، ٹیجے ہوش میں
 رہنے نہیں دے رہیں۔ درد ٹیجے ہوش کھوئے نہیں
 دیکھ رہا۔

میں بول کر کسی دوسرے کو بھی خط نہیں لکھوا
 سکتی، میں الفاظ اٹھانے کرنے کے قابل نہیں رہی میرا
 ذہن درد اور اذیت سے ماؤف ہو رہا ہے۔ میرے منہ
 سے کراہوں کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل پارہا۔ لہ
 تکلف اتنی ہے کہ میں... میں کراہ بھی نہیں رہی۔
 منہ کھولنے کی کوشش میں میرے چہرے کی جلی ہوئی
 جلد اور گوشت چمکنے لگتا ہے۔ خون اور پیپہ پڑنے لگی
 ہے لفظ کراہ بن جاتا ہے۔

میوہا ہسپتال کے برن یونٹ میں ایک بستر پر
 اپنی زندگی کے آخری گھنٹے گزار رہی ہوں۔ میرا ستر
 صد جسم جل چکا ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے
 زندگی اور موت کی گفتگو سے دوچار ہوں۔

میرے پیارے اللہ!
 آپ کے نام یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے، بچپن
 میں ایک بار ایک کہانی پڑھی تھی۔ ایک یتیم بچے کی
 کہانی جسے اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے کچھ
 رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے نام ایک چچی
 لکھتا ہے، وہ چچی ڈاک خانے والے کھول لیتے ہیں
 اور پھر اس بچے پر ترس کھاتے ہوئے کچھ رقم آکھتی
 کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھیج دیتے ہیں۔
 تب وہ کہانی پڑھتے ہوئے مجھے ترس سے زیادہ اس
 بچے پر رشک آیا تھا جس پر دنیا نے ترس کھالیا۔
 مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں ایک
 وقت ایسا آئے گا، جب مجھے بھی اللہ کے نام ایسا ہی
 ایک خط لکھنا پڑے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا اس
 خط کو کھول کر پڑھنے کے بعد بھی کبھی مجھ پر ترس نہیں
 کھائے گی۔ یا شاید لوگ کبھی اس خط کو پڑھ ہی
 نہیں پائیں گے۔

”نہیں کیا یہ کہوں کہ پڑھنا نہیں چاہیں گے۔“
 ”نہیں کیا۔ کہوں کہ یہ خط ان تک پہنچ ہی
 نہیں پائے گا۔“

کاغذ پر سیاہی سے لکھی ہوئی تحریر دیکھی جاسکتی
 ہے۔ پڑھی جاسکتی ہے۔ سوچ کی لہروں پر بھیجی جانے
 والی تحریر کتنے لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ لکھنے والے اور اللہ
 کے سوا۔؟ میری خواہش تھی، میں بھی اس بچے کی
 طرح ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھتی اور پھر اسی طرح لکھنے
 پر اللہ کے نام لکھ کر ڈاک کے سپرد کر دیتی، مگر میں ایسا

راکھ۔ جلی ہوئی عورت کو کیا کہتے ہیں؟ پچھلے چوبیس
 گھنٹوں سے میں جن سوالوں کے جواب تلاش کر رہی
 ہوں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔
 میری ناک میں لگی ہوئی آئینہ کی ٹالی دنیا میں
 میری آخری سانسوں کو ممکن بنا رہی ہے۔ میرے
 دائیں ہاتھ کی آبلہ بنی ہوئی پشت میں پیوست ایک
 ڈرپ قطرہ قطرہ کر کے میرے اندر وہ جی پختہ رہا ہے
 جو میرے وجود کو اس ہولناک اذیت سے بچھڑا رہا ہے
 بھی نہیں دے رہی۔ میں گردن سے پیروں تک ایک

کھانے کے اعلان قرار دے دیا ہے۔
 ”یہ لگے ایک دو گھنٹوں میں مر جائیں گی۔“ میں
 اپنے بستر پر کچھ فاصلے پر ڈاکٹر کو کچھ دیر پہلے کہتے
 تھا۔ سوچتا نہیں کس سے مخاطب تھا۔
 ”ابو۔۔۔ مہوش سے۔۔۔ حجاج
 کھانے کے پتہ نہیں کس سے۔۔۔؟“

میرا اس نے یہ کہا ضرور تھا میں نے اپنے کانوں سے
 سنا تھا۔ کان۔۔۔؟ پتہ نہیں انہیں کان کسنا اب ٹھیک
 ہو گیا نہیں۔ جلنے کے بعد چیزوں کو کوئلہ کہتے ہیں یا

سلاخ دار پتھرے میں ہوں جس کو سفید رنگ کی ایک چادر سے ڈھانپا گیا ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اگر امیر کے جسم سے نہ چھوئے میرے جسم پر موجود گوشت چربی کھال سب کچھ جل کر صرف خون آلودہ اور پیپ زدہ ایک ڈھیر رہ گیا ہے۔ اور ڈاکٹر اس ڈھیر کو مزید کسی تکلیف سے بچانے کے لیے اس پر کپڑا چھونے نہیں دے رہے۔

میں اپنا ہاتھ اٹھا کر چہرہ چھو نہیں سکتی۔ مگر میں پھر بھی جانتی ہوں وہاں اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میرے چہرے کے سارے نقوش مسخ ہو چکے ہوں گے۔

”ہاں۔۔۔ ہاں مگر آنکھیں۔۔۔ آنکھیں اب بھی باقی ہیں۔ آنکھیں اب بھی دیکھ سکتی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ اور دکھائی دے سکتی ہیں۔۔۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹوں سے خود پر نظریں ڈالنے والے ہر شخص کی آنکھ کی پتلی میں اپنی شبیہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہر شخص نظریں چراچا جاتا ہے مجھے اپنی شبیہ نظر نہیں آتی۔۔۔ چوبیس گھنٹے۔۔۔ چوبیس گھنٹے۔۔۔

صرف چوبیس گھنٹے ہی تو گزرے ہیں مجھے گوشت پوست کے ایک نارمل انسان سے جھٹکے ہوئے اس بے شناخت ڈھیر میں تبدیل ہوئے۔ چوبیس گھنٹے پہلے میں اپنی انگلیوں کے پوروں سے اپنے چہرے کے ہر نقش کو محسوس کر سکتی تھی۔ ناک کی باریک اٹھی ہوئی نوک۔ ہونٹوں کی مخصوص ساخت۔ گالوں کی ملائم جلد۔ بھنٹوں کے بال۔ دراز خندار پلکیں، تھوڑی کا گڑھا، مسکرائے پر گالوں میں پڑنے والے ڈمپھل، کانوں کی نرم لو اور اس میں لٹکتی ہوئی بالیاں، کمر تک لمبے سیاہ گتے اور ملائم بال جو بہت اچھی طرح پاندھے جانے کے باوجود میرے ماتھے اور گالوں پر بکھرے رہتے تھے اور جنہیں میں ہر وقت کانوں کے پیچھے اڑتی رہتی۔۔۔ اور۔۔۔ دراز خندار پلکیوں والی سیاہ ہستی ہوئی آنکھیں۔

اب وہاں کیا ہے؟ میں جانتی ہوں۔۔۔ میں نہیں

جانتی۔

مجھے آپ کو تو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں آپ کو یہ سب کچھ بتانے کے لیے تو خط نہیں لکھ رہی۔ میں تو آپ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔

”کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟“

وردے کہ بڑھتا سی چادر ہے۔ زس میری ناک میں لگی ہوئی نالی کو ٹھیک کر رہی ہے۔ اس نے آسجین کے پرشر میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ میں محسوس کر سکتی ہوں۔ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ترحم ہے۔ ترس ہے؟ خوف ہے؟ کیا ہے؟ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہو رہی ہیں۔

میرے بستر کے پاس کھڑے لوگ میری سانسیں رکن رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے میں مر جاؤں۔ میں جانتی ہوں، وہ چاہتے ہیں میں اس اذیت سے

بچ جاؤں، مجھے تم ہے۔۔۔ میری آنکھیں غماز سے ہیں۔ میری آنکھیں غماز سے ہیں۔ میری آنکھیں غماز سے ہیں۔ میری آنکھیں غماز سے ہیں۔

جو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔۔۔ وہ یاد نہیں آ رہا ہے۔۔۔ میں کیوں یاد نہیں آ رہا ہے۔۔۔ یہ سوال پوچھتے پوچھتے بغیر مرنا نہیں چاہتی۔ کہے

میرا سوال؟ مگر سوال۔۔۔ مگر سوال۔۔۔ میں یاد کر رہی ہوں، مجھے یاد آ جائے گا۔ کوئی میرے بستر کے پاس رو رہا ہے۔ میں آنکھیں کھولے بغیر ہی آواز پہچان سکتی ہوں۔۔۔ آخری سانسیں لینے ہوئے بھی ان سسکیوں کو شناخت کر سکتی ہوں۔

وہ میری ماں ہے۔۔۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں اسے اسی طرح اپنے سرہانے دیکھ رہی ہوں۔ جیسے کہ کی ملی کی طرح وہ۔۔۔ وہ میرے بستر کے گرد پھرتی ہے۔ میرے دائیں جانب۔۔۔ پھر میرے بائیں جانب۔۔۔ دائیں جانب۔۔۔ بائیں جانب۔۔۔ وہ روٹی ہے۔ چپ ہو جاتی ہے۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے سورۃ سے آیات اور دعا میں پڑھتی ہے۔ مجھ پر پھرتی ہے۔ مجھے دیکھتی ہے۔ پھر رونے لگتی ہے۔

میں نے جس شاہکار کو تخلیق کرتے اور حفاظت سے رکھتے ہوئے گزار دیے تھے۔ اسے کچھ دوسرے لوگوں نے چھوئی گھنٹوں میں ناقابل شناخت کر دیا تھا۔ وہ کس کس کا چہرہ لوچنا چاہتی ہوگی؟ کس کس کو بے شناخت کر دینا چاہتی ہوگی؟ برن ہونٹ کے اس بستر پر کس کس کو دیکھنا چاہتی ہوگی؟ پتہ نہیں۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔ نو ماہ اس نے مجھے اس اپنے جسم میں رکھا اور بیس سال اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح میرے بستر کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔

کچھ پڑھتی ہے۔۔۔ پھر پھونکتی ہے۔۔۔ وہ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ کئی دینے کے لیے نا محبت۔۔۔ تانے کے۔۔۔

وہ میرا ہاتھ پھونکے گی تو میرے ماتھے کی مجلسی ہوئی جلد اپنی جگہ چھوڑنے لگے گی۔ میں اور کرا ہوں گی۔ وہ میرا گال چوسے گی تو وہاں موجود آبلے ہونٹ پڑیں گے۔ میں چیخوں گی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے گی اور میرے جھٹکے ہوئے گوشت میں سے خون رسنے لگے گا۔ میں اذیت برداشت نہیں کر پاؤں گی۔۔۔ کبھی ماں کے لمس کو آپ نے اولاد کے لیے بڑھائی ہے۔ دیکھتے ہیں؟ وہ روٹی جاتی ہے۔ میرے بستر کے گرد چکر کاٹتی جاتی ہے۔

نو ماہ اس عورت نے اپنے جسم کے اندر مجھے تخلیق کیا ہے۔۔۔ من کو۔۔۔ میری ہڈیاں، میرا گوشت، میری جلد، میرا خون۔۔۔ سب کچھ اسی کے وجود ہی کا تو ایک حصہ تھا۔

میں اس لیے اس نے ایک مکمل وجود کو جنم دیا تھا۔۔۔ جسے اٹھکاتے ایک مکمل وجود۔۔۔ جس میں حال بعد اس مکمل وجود کو جھٹکے ہوئے پیپ زدہ گوشت کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھ کر وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔؟ اسے فرار کیسے آ سکتا ہے۔؟

”باااااں میں تیل لگایا کرو سمن! اس طرح لا پرواہی مت برتا کر۔۔۔“ میں اب بھی اس کی آواز سن سکتی ہوں۔ مگر اب میرے سر پر بھجلائی ہوئی جلد کے علاوہ کچھ ہی ہے۔

اس کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کوئی ایشن اب میرے جسم کی رنگت کو بدل سکتا ہے نہ اس کی ملائمت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

”کتے کھورے ہو رہے ہیں تمہارے ہونٹ۔۔۔“ والدی لگاؤ ان پر۔۔۔ وہ اب شاید شناخت بھی نہیں کر سکتی ہے۔ میرے ہونٹ کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہو جاتے ہیں۔؟

اس کا خرید ا ہوا کوئی لباس اب میرے جسم کو ڈھانڈھنے سے ممتاز نہیں کر سکتا تھا۔ بیس سال اس

نے جس شاہکار کو تخلیق کرتے اور حفاظت سے رکھتے ہوئے گزار دیے تھے۔ اسے کچھ دوسرے لوگوں نے چھوئی گھنٹوں میں ناقابل شناخت کر دیا تھا۔

وہ کس کس کا چہرہ لوچنا چاہتی ہوگی؟ کس کس کو بے شناخت کر دینا چاہتی ہوگی؟ برن ہونٹ کے اس بستر پر کس کس کو دیکھنا چاہتی ہوگی؟ پتہ نہیں۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔ نو ماہ اس نے مجھے اس اپنے جسم میں رکھا اور بیس سال اس نے مجھے اس اپنے گھر میں رکھا اور مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح میرے بستر کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔

میں سوچ رہی ہوں اللہ! آپ مجھے اس حال میں دیکھ کر کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ تخلیق تو مجھے آپ نے ہی کیا ہے۔ کئی صدیاں تو مجھے آپ نے بھی اپنے پاس رکھا ہے۔ میری آنکھیں، ناک، ہونٹ۔۔۔ سب کچھ آپ نے ہی بنایا تھا۔ اب اس جھٹکے ہوئے جسم کو دیکھ کر آپ کیا سوچ رہے ہوں گے، جس چیز کو آپ نے بنایا۔ انسان نے اسے بگاڑ دیا۔ جلا دیا، مسخ کر دیا۔۔۔ آپ مجھے دیکھتے ہوئے کس اذیت سے گزر رہے ہوں گے؟ میری ماں کی طرح کیا آپ بھی بہت سے لوگوں کو۔۔۔

”کب۔۔۔؟“

”کب۔۔۔؟“

میں اب ڈاکٹر کی آواز اپنے قریب سن رہی ہوں۔ وہ ایک بار پھر مجھے دیکھنے آیا ہے۔ میں اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس کے قریب کھڑے اپنے باپ کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے چہرے پر اب بھی وہی بے یقینی ہے جو پچھلے چوبیس گھنٹوں سے جیسے اس کے چہرے پر کندہ ہو گئی ہے۔ اسے یقیناً ”اب تک یقین نہیں آیا ہو گا کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی بیٹی کے ساتھ ہوا ہے۔“

اخبار میں چھپی ہوئی سرخی پڑھنے اور اسے اپنے سامنے مجسم حالت میں دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پھر اگر آپ اس ”سرخی“ سے خونریز رشتہ رکھتے ہوں تو۔۔۔؟“

پچھلے چوبیس گھنٹوں میں، میں نے اس کے ہاتھوں میں انجیکشنز کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا وہ انجیکشنز اتنے بڑے تھے ان انجیکشنز کو ڈرپ میں منتقل کر دیتی ہے۔ اس کے گھنٹوں زود ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈاکٹر کے لئے اب کچھ بھی واپس نہیں لاسکتے۔ نہ میرا چہرہ۔ نہ اس کے نقش۔ نہ میرا بے داغ جسم۔ نہ میری۔۔۔ نہ میری زندگی۔ ہاں ان ہاتھوں سے وہ اگر کچھ روپے زیادہ کمالیتا تو آج میرا وجود جلے ہوئے گوشت کے اس ڈھیر میں تبدیل نہ ہوا ہوتا۔ اس کے چہرے کی بے یقینی اب شکست خوردگی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ کبھی نہ کبھی انسان ہار مان ہی لیتا ہے۔ ہار مانتی ہی ہڑتی ہے۔۔۔ اور بیٹیوں کے مقدر سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز باپ کے کندھوں کو نہیں جھکا سکتی۔

دوسری بیٹی کو بیاہنے کا حوصلہ کہاں سے لائے گا وہ۔۔۔ موش کو۔۔۔
 ”میرے جیسے بھائیوں کو موت آجانی چاہیے جو بہنوں کو ٹرک بھر کر جینز نہیں دے سکتے۔“

”سجاد۔ سجاد۔ کہاں ہے۔۔۔؟ میں نے اسے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دیکھا ہے۔ تب جب کل رات کو وہ حیدر آباد سے میرے جلنے کی خبر سن کر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور کپڑے بے ترتیب تھے۔ میں تب ہوش میں بھی اس نے آگے بڑھ کر صرف ایک نظر مجھے دیکھا تھا، میری اور اس کی نظریں پھر وہ کچھ کہے بغیر اگلے قدموں وارڈ سے بھاگ گیا۔ مگر بلند آواز میں اس کے رونے کی آواز اندر تک آئی رہی وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

”میرے جیسے بھائیوں کو موت آجانی چاہیے جو بہنوں کو ٹرک بھر کر جینز نہیں دے سکتے۔“ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز غائب ہو گئی۔ اور اس کے بعد وہ دوبارہ اندر نہیں آیا۔

شاید وہ میرا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔ شاید کوئی بھی میرا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ پھر بھی جب کو میرے سامنے آنا پڑا ہے۔ کیا ان میں

کبھی کسی نے یہ سوچا ہوگا کہ زندگی میں ایک بار وہ بھی اخبار کی ایک خبر کا حصہ بن جائیں گے۔ یہ تو سننے بھی نہیں سوجھا تھا کہ میں۔۔۔ میں اخبار کی ایک خبر بن جاؤں گی۔

”کم چیز لائے پر ایک لڑکی کو زندہ جلا دیا گیا۔“
 ”سرسال کے ہاتھوں ہو کا قتل۔۔۔“

”جینز نے ایک اور لڑکی کو برن یونٹ پہنچایا دیا۔“
 ”ایک سال کے بچے کی ماں کھانا کاتے ہوئے جل گئی۔“ پتہ نہیں اخبار کی سرخی کس طرح لگی ہوگی؟
 ایک سال کا بیٹا۔۔۔؟
 ”مختار۔۔۔؟“

”ہاں وہ کہاں ہے؟ مختار کہاں ہے؟ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں نے اسے بھی نہیں دیکھا۔ پتا نہیں اس بچے کچھ کھایا ہوگا یا نہیں؟ دو دن سے اسے بخار تھا۔ پتا نہیں آج اسے کوئی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہوگا یا نہیں۔؟ میں اس کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”خوشی با۔۔۔ دوبارہ تو کبھی۔۔۔“
 ”آگے سے کھلنا میرے لئے مشکل ہے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ آسجین کی نالی کے ساتھ جی ساس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر میرا ذہن، میرا ذہن ابھی۔۔۔ ابھی جی ڈانٹ نہیں ہوا۔۔۔ چہرے، آوازیں اور چیزیں گڈ گڈ ضرور ہورہی ہیں مگر میں۔۔۔ میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں۔ سوائے اس سوال کے اس سوال کے بس وہ۔۔۔ وہ یاد میں آ رہا۔۔۔ ورنہ زندگی تو سب کچھ یاد ہے مجھے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔“

یہ بھی کہ چوبیس گھنٹوں سے پہلے میں نے ہونٹوں پر کون سی لپ اسٹک لگائی تھی۔ اس کارٹ ہاں ابھی لگی رہی رنگ تھا۔ مجاہد کہتا تھا۔۔۔ یہ رنگ مجھ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ اور چوڑیاں۔۔۔ ہاں چوڑیاں بھی پہنی ہوئی تھیں میں نے۔۔۔ گہری سبز رنگ کی چوڑیاں۔۔۔ آگ کی لپٹوں میں اگر شاید وہ بھی پلھل گئی ہوں گی۔ میرے وجود کی طرح۔

بچپن میں چوڑیوں کی چین بنایا کرتی تھی میں۔ موم بتی جلا کر چوڑی کے ایک سرے کو اس پر گرم کیا

کرتی تھی۔ موم بتی کا شعلہ چند سینکڑوں میں ہی کالج کو پھیلانے لگتا۔ پھر میں آرام سے اس شعلے ہونے دیکھی۔ کو ایک کروٹی اور اس جگہ سے برق رفتاری سے ایک چوڑی اس چوڑی کے اندر ڈال دیتی پھر اتنی ہی تیزی سے شعلے ہوئے سروں کو دوبارہ آپس میں زور سے دبا دیتی۔ کالج ٹھنڈا ہو کر پھر آپس میں جڑ جاتا۔ چین بنی جاتی یا پھر چوڑی کے ٹوٹے ٹکڑوں کو اسی طرح موم بتی کے شعلے پر گرم کرتی اور جب ٹکڑے کا درمیانی حصہ نرم ہو جاتا تو میں دونوں اطراف سے ٹکڑے کو پکڑ کر موڑ دیتی۔ بیضوی شکل کے ان حصوں کو چین کی صورت لگاتی میں سارے گھر میں بھرتی۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوجھا تھا کہ۔۔۔ جی ٹھنڈے ہوئے ان حصوں کے شعلوں کی لپٹیں میرے ہاتھوں میں کھنکتی ان چوڑیوں کے کالج کو پھیلانے کی اور اس بار کالج پھلنے اور نرم ہونے کے بعد میری ہی کلا ہیوں۔۔۔

”اسکارٹ اب ایک سبز چوڑیاں۔۔۔ اور۔۔۔“
 ”پائے۔۔۔ کپڑوں کا رنگ کیا تھا؟ سفید۔ ہاں سفید تھا۔۔۔ سلک کا سفید کڑھائی والا سوٹ۔۔۔“
 ”والٹر کا گنا ہے کہ اس سوٹ کی وجہ سے میرا جسم زیادہ بڑی طرح جلاؤ سفید پیرا۔۔۔ ساہوگر اب بھی مجھے جسم کے بہت سے حصوں پر چپکا ہوا ہے یوں۔۔۔“
 ”میرے ہاتھوں کا ایک حصہ ہی بن گیا ہے۔ میرے اسے ان ٹکڑوں کو اتارنے کی کوشش کی جاتی تو۔۔۔ تو میرے جسم پر موجود آبلے پھوٹ پڑتے۔ کھال اٹھ جاتی۔ پھر شاید وہ زخم مجھے زندہ رہنے کے لیے نہیں کھنٹے بھی نہ دیتے۔ پھر شاید یہ اذیت چوبیس گھنٹوں سے ہی ختم ہو جاتی۔“

”میں نے تو وہ لباس مجاہد کے لیے پہنا تھا۔ اس سے کما تھا کہ میں وہ پیرتے پیرتوں۔۔۔ اس نے کہا تھا وہ میری امی کے کھرے کر جائے گا۔ ہم شام تک پہنچیں گے۔ لیکن پھر۔۔۔ مجھے اب بھی یقین

نہیں آ رہا کہ یہ سب اس نے میرے ساتھ کیا ہے۔۔۔ اس نے۔۔۔ میرے شوہر نے۔۔۔ اس شخص نے جس نے قرآن کی آیات پر میرا فیصل بننے کا عمل کیا ہے۔ آپ کے سامنے اس نے میری حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔۔۔ دو سال۔۔۔ پورے دو سال میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ دو سال میں نے اسے مقدر بھر آرام پہنچانے کی کوشش کی۔۔۔ اس کو سلوٹ زدہ لباس سے بچانے کے لیے میں اپنے کپڑے کھنٹے صرف کر دیتی۔ اور اس نے۔۔۔ اس نے میرے پورے وجود کو سلوٹ زدہ کر دیا۔۔۔

”مجھے یقین نہیں آتا، مجھے یقین نہیں آتا۔۔۔ مجاہد میرے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا ہے۔ وہ تو میرا شوہر ہے۔۔۔ مجھ سے محبت کرتا ہے اس نے مجھے کیسے جلا دیا؟ اس نے مجھے کیوں جلا دیا؟“
 ”مگر ہو سکتا ہے اس نے مجھے نہ جلا یا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے نہیں جلا یا۔۔۔ سب کچھ ایک حادثہ تھا۔۔۔ حادثہ؟ ہو سکتا ہے سب کچھ ایک حادثہ ہی ہو۔۔۔“
 ”مگر۔۔۔ مگر وہ دروازہ۔۔۔ وہ دروازہ کیوں بند تھا؟“

”مجاہد میری بیٹیوں کی آواز پر کیوں نہیں آیا؟“
 ”کوئی بھی مجھے بچانے کیوں نہیں آیا؟ اور وہ جھٹک۔۔۔ وہ جھٹک۔۔۔ کھر کی۔۔۔ مجاہد“
 ”میرے خدا۔۔۔ میرا سانس پھر اکڑ رہا ہے۔ کیا میں مر رہی ہوں؟ کیا موت کی تکلیف ایسی ہی ہوتی ہے جیسی میں اس وقت پچھلے چوبیس گھنٹوں سے برداشت کر رہی ہوں؟ اتنی ہی موت۔۔۔ اتنی مختصر زندگی؟ آپ نے مجھے کیا دیا؟ کیوں دیا؟“

”اٹھارہ سال میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارے۔۔۔ میں خوش تھی، پھر دو سال میں نے۔۔۔ میں نے کہاں گزارے، ہاں شادی ہو گئی تھی میری۔۔۔ ایف اے کے بعد۔۔۔ مجاہد جی۔۔۔ میں ٹھیکوں میں خواب لے کر اس کے کھر آتی تھی۔ ہر لڑکی یہی کرتی ہے۔۔۔ میں بھی خواب لے کر ایک

بجائے ابدھن کیوں سمجھا؟ دو سال میں اس شخص کو بخشنے والی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر میں تڑپ اٹھتی تھی۔ معمولی سی کھانسی ہوتی یا انگلی پر لگنے والی خراش۔ وہ سب تکلیف نہ ہو جاتا مجھے چین نہ آتا۔ اور۔ اور۔ اس شخص نے مجھے اپنے ہاتھوں سے جلادیا۔

میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی اور وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ لی وی فریق وی سی آر زیور موٹر سائیکل کیا اس نے مجھے صرف ان چیزوں کی وجہ سے جلادیا تھا۔ کیا صرف یہ چیزیں نہ لانے کی وجہ سے اس کے دل میں میرے لیے اتنی نفرت بیٹھ گئی تھی۔ کہ میری دو سال کی خدمت اور اولاد بھی اس نفرت کو کم نہیں کر سکی۔

”بھئی پولیس آئے گی۔ تم انہیں بتا دینا کہ یہ حادثہ تھا۔“ وہ اب مجھ سے کہہ رہا تھا۔
 ”حادثہ نہیں تھا۔ تم لوگوں نے مجھے جلادیا۔“ میں نے کہا۔
 وہ کچھ لحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا اور میرے چہرے پر نظرس کاڑے رہا۔
 ”تم پولیس کو یہ کہو گی؟“ اس بار اس کی آوازیں اشتعال تھا۔

”ہاں۔۔۔“
 ”پھر کیا ہوگا؟ تم نے سوچا ہے۔ تم مر جاؤ گی۔ میں جیل چلا جاؤں گا۔ عثمان کا کیا ہوگا۔ وہ کہاں جائے گا؟ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کرو تم پولیس سے یہی کہنا کہ یہ ایک حادثہ تھا اپنے بیٹے کے لیے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟“ وہ اب مدہم آواز میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں! میں نے عثمان کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا کیا ہوگا۔ پولیس اس شخص کو پکڑے گی تو کیا ہوگا؟ مقدمے کی پروی کون کرے گا؟ یہ رہا ہو گیا تو کیا ہوگا؟“ اسے سزا ہو گئی تو عثمان کا کیا ہوگا؟“ میں خاموش ہو گئی۔
 میرے پاس لفظ ختم ہو گئے۔ صرف زندگی باقی رہ گئی۔ عورت کے پاس صرف زندگی ہوتی ہے اور پھر۔۔۔

نہیں ہوتا۔

میں نے اپنی سانس کو دیکھا ان کے ساتھ مچلنے کی کچھ اور عورتیں تھیں وہ رو رہی تھیں غش کھا رہی تھیں۔

”کاش میں سوئی نہ ہوتی۔ کیوں نہیں آگئی مجھے۔ مجھے کیا پتا تھا میری بہو کے ساتھ یہ ہو جائے گا۔ اس کے بجائے میرے ساتھ یہ ہو جاتا۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

میں انہیں دیکھ رہی تھی میں نے اپنی ماں میں رحم کے علاوہ اور کوئی صفت نہیں دیکھی تھی۔ ماؤں میں رحم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا یہ میری خوش قسمتی تھی۔ دو سال میں نے اس عورت میں بھی یہی صفت تلاش کرنے کی کوشش کی تھی نہ کبھی تو اس کی زبان کے کانٹے ختم ہوں گے۔ کبھی تو اس کے لفظوں کا زہر کم ہوگا۔ کبھی تو۔۔۔ لیکن سب کچھ بڑھتا گیا۔ انہیں مجھ پر رحم نہیں آیا۔ لی وی فریق وی سی آر اور موٹر سائیکل لانے والی بہو پر رحم کیسے کہا جا سکتا ہے؟

”کیا انہیں احساس ہے کہ کتنے ہوئے مجھ کی تکلیف۔۔۔ کسی ہوتی ہے؟ جب پورا جسم موسم ہٹی کی طرح پھل رہا ہو۔ جلد کھال چربی گوشت سب کچھ جل رہا ہو اور انسان چاہنے کے باوجود شعلوں کو بجھانہ سکتا ہو۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔؟“

میں اب اپنی جھول کو دیکھ رہی تھی جو میری سانس کی طرح رو رہی تھیں۔ مجھے جلاتے ہوئے کیا انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر انہیں خود کبھی میری طرح جلنا پڑا۔ ان کو۔۔۔ یا کبھی آج سے کئی سال بعد ان کی بیویوں میں سے کسی کو۔۔۔

دو سال میں نے کئی بار انہیں ڈائجسٹوں میں شامل ہونے والی تحریروں کے کرداروں کے لیے آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ کیا صرف رحم اور ہمدردی ان کے لیے ہوتی چاہیے؟ جو زندہ نہ ہوں فرضی کردار ہوں۔ میرے جیسے حقیقی کرداروں کے لیے ان کے پاس۔ کیا میرے کم جینا لانے کے ”دکڑناہ“ کو وہ معاف نہیں کر سکتی تھیں؟ کیا کبھی ایک بار وہ میری سانس سے نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میرے ساتھ سب کچھ نہ

کریں۔ مجھے تکلیف نہ دیں کیا وہ ماجد سے یہ سب نہیں کہہ سکتی تھیں۔ کیا وہ۔۔۔

پھر کچھ دیر بعد میرے گہروالے آگئے۔ پھر پولیس آئی۔ مجاہد اور اس کے گہروالے تائب ہو گئے تھے۔ میں نے اس کے بعد انہیں نہیں دیکھا۔ میرے گہروالے انہیں الزام دے رہے تھے مجھ کے بہت سے لوگ بھی یہی کہہ رہے تھے۔ پولیس کے ایک انسپکٹر نے مجھ سے بیان لینے کی کوشش کی۔

”کیا یہ حادثہ تھا؟ کیا مجھے میرے سرال والوں نے جلایا؟ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟“ چون کا دروازہ باہر سے کھل گیا کیا میں نے خود کشی کی کوشش کی ہے؟ کیا مجھے کسی پر شک ہے؟ میرے سرال والوں کا رویہ میرے ساتھ کیا تھا؟ میرے شوہر کا سلوک کیسا تھا؟“

وہ مجھ سے ایک کے بعد ایک سوال پوچھتا رہا۔ خاموشی اور کراہوں کے علاوہ میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔
 ”تجربہ کاروں کی اپنی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

بستر مرگ پر پڑی اب میں کس سے ڈر سکتی ہوں؟ مگر۔۔۔ سچ بتانے کی ہمت میرے ہاتھ نہیں ہے۔ وہ معاشرے نے چین لی ہے۔

وہ بہت دیر مجھے بولنے پر مجبور کرتا رہا پھر میری سانس اکٹرنے لگی تو ڈاکٹر نے اسے باہر بھیج دیا۔ ”ختم ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ۔۔۔ اس کے جاننے کے بعد میری امی نے کہا اور پھر بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگیں۔ میں ایک بار پھر غشی میں چلی گئی۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب۔۔۔ اب جب ڈاکٹر میرے گہرو والوں کو بتا چکے ہیں کہ میں کسی بھی لمحے مر جاؤں گی۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ وہ سوال مجھے مرنے نہیں دے رہا ہے۔ وہی سوال جو۔۔۔ جو مجھے یاد نہیں ہے۔
 ”لو میرے اللہ۔۔۔“

میری تکلیف۔۔۔ میری تکلیف۔۔۔

میرا ذہن۔۔۔
 آنکھیں نہیں کھل رہیں۔
 سانس۔۔۔ سانس۔۔۔
 میرا جسم بے جان۔۔۔
 سب کچھ ختم۔۔۔
 میرا بیٹا۔۔۔
 کیا یہ موت۔۔۔
 وہ سوال۔۔۔

ہاں۔۔۔ ہاں یاد۔۔۔ یاد۔۔۔ آ رہا ہے
 میں۔۔۔ میں آپ سے۔۔۔ پوچھنا۔۔۔
 پوچھنا چاہتی ہوں۔۔۔
 آپ نے کہا تھا۔۔۔ اگ کا عذاب صرف۔۔۔
 صرف اللہ۔۔۔ اللہ دے سکتا ہے۔۔۔ آپ
 دے سکتے ہیں۔۔۔

اور کوئی نہیں۔۔۔ انسان نہیں۔۔۔ مگر مجھے
 مجھے تو انسانوں۔۔۔ انسانوں نے اگ کا
 عذاب دے دیا ہے۔۔۔

میں نے۔۔۔ میں۔۔۔ اسی دنیا میں دوزخ کے
 عذاب سے گزر رہی ہوں۔۔۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ
 دوزخ انسان نے دے دیا ہے۔۔۔

میں پوچھنا چاہتی ہوں اب۔۔۔ اب۔۔۔
 جب میں مر جاؤں گی۔۔۔ تو کیا آپ۔۔۔ آپ مجھے
 دوبارہ دوزخ۔۔۔ میں پھینکیں گے؟

دوسرے دوزخ میں۔۔۔ کیا آپ میرے لیے
 دوبارہ دوزخ دے گا میں گے؟ دوبارہ مجھے اس میں
 پھینکیں گے؟

میں آپ کو بتانا۔۔۔ بتانا چاہتی ہوں۔۔۔ مجھے
 مجھے انسانوں کے دوزخ۔۔۔ سے گزرنے
 گزرنے کے بعد آپ کے دوزخ سے خوف

نہیں آ رہا۔۔۔ دوسرے دوزخ سے۔۔۔ اللہ کیا
 کیا آپ۔۔۔ مجھے۔۔۔
 دوسرا۔۔۔ دوسرا دوزخ دیں گے؟ میں۔۔۔
 سانس۔۔۔ میں۔۔۔ اندھیرا۔۔۔

ختم۔۔۔